سرسید اور علماء

کے

اختلاف کی بنیاد

(ایک غلط فہمی کا ازالہ)

ضیاء الدین لاہوری

سرسید احمد خان نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل متعدد مذہبی رسائل تصنیف کئے جنہیں قبول عام کا درجہ حاصل ہوا ، لیکن جنگ آزادی کے بعد جب انہوں نے مذہب سے متعلق جدید نظریات پر مبنی تحریریں پیش کیں تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت بن گئے ۔ اُن کی مخالفت اس وقت عروج کو جا پہنچی جب ان کی سرپرستی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ بحث و مباحثہ کا یہ سلسلہ دار العلوم کے قیام کے بعد بھی کافی عرصہ جاری رہا ۔ زمانہ کروٹ لے چکا تھا لہذا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مخالفتوں کے طوفان کم ہوتے گئے ۔ ایک نسل ختم ہوئی اور دوسری نے جنم لیا ۔ جب وہ جوان ہوئی تو گزشتہ واقعات کے پس منظر سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں ، یا کر دی گئی تھیں ۔ انگریزوں اور ان کے کارندوں کا تیار کردہ تعلیمی نصاب جو کچھ سکھاتا رہا ، ہم اُسے من و عن قبول کرتے رہے اور خود کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی ۔ اگر کوئی کوشش ہوئی بھی تو حقائق کو قبول کرنا ایک کٹھن مرحلہ بن گیا کیونکہ تصویر کا ایک رُخ ، جو بچپن ہی سے دماغ میں جا گزیں ہو چکا تھا ، دوسرے رخ کے واضح ہو جانے کے باوجود اسے رد کرنا اپنی توہین اور حقارت آمیز امر

دکھائی دیتا تھا ۔ تا ہم جنہوں نے حقائق پیش کرنے کی جسارت کی ، انہیں بوجوہ مصنوعی جذباتی تحریروں کے ذریعے ایسا کرنے سے روک دیا گیا ۔ اس رد عمل کے نتیجے میں بہت سے محققین اس موضوع پر تحقیق کرنے کی طرف راغب نہ ہو سکے ، لہذا انشا پردازی کے زور سے حقائق کو مزید مسخ کرکے رکھ دیا گیا ۔

اگر بات یہیں تک محدود رہتی تو بھی کسی حد تک گوارا تھا مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایک منصوبے کے تحت بعض کتابوں میں قطع و برید کی گئی تاکہ جدید نسل کو مکمل اندھیرے میں رکھا جا سکے ۔ ان کتابوں میں مولانا حالی کی «حیات جاوید» اور شیخ محمد اکرام کی «موج کوثر» بھی شامل ھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم غلط مفروضوں کو حقائق سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھتے ھیں اور جس کے باعث سرسید کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر باقاعدہ تحقیق کئے بغیر کسی حتمی رائے تک پہنچنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کی جستجو میں الفاظ کے گورکھ دھندوں پر مبنی مضامین کا سہارا لینے کی بجائے ہم اصل ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ اپنی قومی زندگی کے ماضی کو صحیح طور پر پیش کر سکیں ۔

بعض حلقوں کی عادت ہے کہ اس قسم کے متنازعہ امور میں خود تو ایک فریق کو خواہ مخواہ مطعون ٹھہراتے رہتے ھیں مگر جب اس کے جواب میں اصل حقائق پیش کئے جائیں تو اسے گڑے مردے اکھاڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ یہ طرز عمل انصاف کے ترازو پر پورا نہیں اترتا ۔ گزشتہ واقعات ہمارے لئے تکلیف دہ ہوں یا باعث فخر ، ہمیں اپنی قومی و ملّی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں ایک اہم کردار اداکرناچاھیئے ۔ اگر ہم حقائق سے چشم پوشی کا ارتکاب کریں ، یا واقعات کو غلط رنگ میں پیش کرکے قبائح کو محاسن اور محاسن کو قبائح قرار دے ڈالیں تو یہ فیصلے ہماری قومی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہوں گے اور ہم غلط نہج پر پڑ کر ٹھوکریں کھائیں گے ۔ کسی کی برائیوں پر پردہ ڈالنا اور بات ہے لیکن اُنہیں مستحسن صورت میں پیش کرنا

بدقسمتی کی انتہا ہے ۔ کمزوریاں بہر حال کمزوریاں کہلانی چاہئیں اور اچھائیاں صرف اچھائیاں۔ غلطی غلطی ہے ، اگر چہ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ ہو بلکہ دوسروں کی بھلائی کے جذبہ میں کی جائے ، مگر محض اس وجہ سے کہ غلطی کرنے والے کی رائے خلوص پر مبنی تھی اس پر دیانت دارانہ رائے دہی سے گریز کیا جائے تو وہ غلطی نئی نسل کے سامنے ایک نیک عمل کی صورت اختیار کر جائے گی اور ہم بھٹک جائیں گے ۔ شبلی نعمانی کے مطابق :

"اگر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے ، لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں ۔ پھر ایشیائی شاعروں میں کیا برائی ہے ، سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے"(۱) ۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ واقعات سے قومیں سبق سیکھتی ہیں اور مستقبل کے لئے بہتر لائحہ عمل تجویز کرتی ہیں ۔ مجھے کسی فریق کی تحقیر مطلوب نہیں ، کون کس حد تک صحیح یا غلط تھا اس وقت اس سے بحث نہیں ، میرا مقصود صرف یہ ہے کہ جو بات کہی جائے دیانت دارانہ تحقیق سے نتیجہ اخذ کرکے کہی جائے ۔

جب ہم ہندوستان میں ایک صدی قبل کے دور کی اپنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سرسید اور علماء اسلام میں باھمی کشمکش کا سماں دکھائی دیتا ہے ۔ بلاشبہ علماء کرام نے اجتماعی اور انفرادی طورپر سرسید کی زبردست مخالفت کی ۔ اس کا پس منظر کیا تھا ، علماء کی انگریزی تعلیم سے نفرت ، انگریزی حکومت کے استحکام کے لئے سرسید کی کوششیں یا کچھ اور ؟ مشہور محقق شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں سرسید کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس مخالفت کے متعلق عوام بلکہ خواص میں بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں . . . . سب سے بڑی غلط فہمی ، جو اس

بارے میں بہت عام ہے ، یہ ہے کہ علما نے سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے ۔ ہم نے سرسیدکے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے اور ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علما اور اسلام کے ساتھ صریح بے انصافی ہے«(۲) ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس مخالفت کی بنیاد کیا تھی ؟ شیخ محمد اکرام اس کے جواب میں اپنی تحقیق کا لب لباب یوں بیان کرتے ہیں ۔

«اس معمہ کے حل کرنے کے لئے ان مضامین اور فتاوی کا مطالعہ کرنا چاہئے جو سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں شائع ہوئے ۔ ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لئے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے ۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاوی میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے ، بلکہ یہی ہوتا ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں ، اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں ۔ شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتب میں کر رہے تھے ، سرسید نے ایسا نہیں کیا لیکن ان کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بد ظن ہو جاتے تھے«(۳) ۔

سرسید کے مذہبی خیالات میں تبدیلی کا پہلا عکس ہمیں ان کی

تصنیف "تبیین الکلام فی تفسیر التورات و الانجیل" میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق وہ خود رقم طراز ہیں کہ :

میری تفسیر پڑھنے والا جا بجا میری تفسیر میں پائے گا کہ میں کچھ پابند نہیں رہا ہوں ان قولوں کا جن کو یہودی عالم یا عیسائی عالم یا مسلمان عالم بلا تحقیقات بطور باپ دادا کے تبرک کے مانتے چلے آئے ہیں"[۴] ۔

اس کے بعد جب انہوں نے "احکام طعام اهل کتاب" لکھی اور اس میں ذبیحہ کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ :

اگر اهل کتاب کسی جانور کی گردن توڑ کر مار ڈالنا یا سر پھاڑ کر مار ڈالنا زکوۃ سمجھتے ہوں تو ہم مسلمانوں کو اس کا کھانا درست ہے"[۵] ۔

تو مسلمان ان کے سخت خلاف ہو گئے ۔ سرسید نے ان خیالات کا نہ صرف اظہار ہی کیا بلکہ سفر لندن کے حالات میں ان پر عمل کرنے کا دعوی بھی کیا اور جھٹکے اور گردن توڑ کر مارے گئے پرند جانوروں کے گوشت کے بارے میں یہ لکھا کہ :

"میں نے اور ہمارے ساتھیوں نے ان دونوں قسموں کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت ، مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے"[۶] ۔

تو ان کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی اور ان کے اس عمل کو ان کے کافر ہو جانے کا ثبوت قرار دیا گیا ۔

بعد ازاں "الخطبات الاحمدیہ" کی تصنیف کے دوران لندن سے اپنے عزیز ترین دوست نواب محسن الملک کو خط لکھتے ہوئے اس کے متعلق خود یہ پیشن گوئی کی :

" میرے ہم قوم اس محنت کی ، جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے ، قدر نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں

گے اور کافر بتلائیں گے کیونکہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں اور شاید دو یا تین مسئلوں میں جمہور سے اختلاف کیا ہے اور چند علما کی رائے سے اتفاق کیا ہے(۷) ۔

لندن سے واپسی پر انہوں نے دو بڑے کام کئے ۔ پہلا تہذیب الاخلاق کا اجرا اور دوسرا مدرسة العلوم مسلمانان کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا ۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین ,,جمہور سے اختلاف،، کا سب سے بڑا ذریعہ بنے اور اس کے بعد وہ عمر بھر ان خیالات کی اشاعت میں مصروف رہے ۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :

,, ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے ، مثلاً شیطان ، اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار ، حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے ،،(۸) ۔

مولانا حالی نے ,, حیات جاوید،، میں ان مسائل کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن میں سرسید نے علماء سلف سے اختلاف کیا ہے ۔ یہ فہرست کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ اس میں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا ذکر ہے ، وہ تحریر کرتے ہیں :

,, حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور تمام انبیاء سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں جیسے ید بیضا ، عصا کا اژدھا بن جانا ، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا ، خدا کا موسیٰؑ سے کلام کرنا ، پہاڑ پر تجلی کا ہونا ، گوسالۂ سامری کا بولنا ، ابر کا سایہ کرنا ، من

و سلویٰ کا اترنا یا عیسیٰؑ کا گہوارہ میں بولنا ، خلق طیر ، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا ، مردوں کو زندہ کرنا ، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ ، ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا»(۹) ۔

سرسید نے مندرجہ بالا عقائد کا اظہار ایک صدی قبل کیا ، ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مقام ہے کہ روشن خیالی کے موجودہ دور میں بھی جب کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان مغربی علوم کی دولت سے مالامال ہیں ، اگر ان خیالات کا اظہار کیا جائے تو اس پر کیا ردّ عمل ہو سکتا ہے ؟ لہذا سرسید کے زمانے میں ان کی مخالفت ایک فطری امر تھا ۔ مخالفین کے ذکر سے قطع نظر خود ان کے دستِ راست نواب محسن الملک کی مخالفت کا حال اُن ھی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے :

» یہ سچ ہے کہ ھمارے مسلّمہ عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انہوں نے شد و مد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علما کو اُن کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہہ تھا ، اور بعض نے یہاں تک کفر کے فتوے بھی دے دئیے ۔ اور اُن کو کیا کہوں ، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں اُن سے اختلاف کرنا پڑا ، بحث و مباحثے رھے»(۱۰) ۔

اس کے علاوہ ایک اور لکچر میں انہوں نے بیان کیا :

» شاید سب سے پہلے میں نے ھی اُن کے کفر کا فتویٰ دیا تھا ، ان کو چھپا پادری کہا»(۱۱) ۔

مولانا حالی سرسید کے اتنے عظیم معتقد تھے کہ جب انہوں نے سرسید کی سوانح »حیات جاوید« کے نام سے لکھی تو شبلی نعمانی نے اسے »مدلل مداحی« قرار دیا اور دیگر نقادوں نے بھی اس کتاب میں موافقانہ مبالغہ آرائی کی شکایت کی ۔ سرسید سے زبردست عقیدت کے باوجود مولانا حالی نے خود کئی مقامات پر اُن سے اختلاف کیا ہے ۔ اس اختلاف اور عقیدت کا ملا جلا

اظہار ان کے مندرجہ ذیل بیان سے بخوبی ہوتا ہے جس میں انہوں نے سرسید کی تفسیر القرآن کے متعلق رائے دی ہے :

"سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں ، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں"(۱۲) ۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سرسید کے بہترین رفقائے کار میں شمار کئے جاتے ہیں ۔ وہ علی گڑھ تحریک کا ایک ستون تھے ۔ سرسید نے کئی موقعوں پر اُن کی شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے ۔ سرسید کے هم سوار ہونے کے باعث مخالف اخباروں میں اُنہیں "نیچری بھانڈ" کا خطاب دیا گیا اور سرسید کے مخالفین سے لاہور کی عدالتوں میں ان کی مقدمہ بازی (۱۳) بھی ہوتی رہی ۔ اُنہوں نے خود قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی ہے ۔ سرسید کی تفسیر پر وہ ان الفاظ میں رائے زنی کرتے ہیں :

"مجھ کو اُن کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں ۔ سید احمد خان صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ میرے نزدیک وہ تفسیر دیوان حافظ" کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے سارے دیوان کو کتاب تصوف بنا نا چاہا ۔ جو معانی سرسید احمد خان صاحب نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے) ، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل . . . . یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا ، نہ جبریل حاملِ وحی کا ، نہ رسول خدا کا ، نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا ، نہ اصحاب کا ، نہ تابعین کا ، نہ تبع تابعین کا ، نہ جمہور مسلمین کا"(۱۴) ۔

سرسید کے مذہبی نظریات کے متعلق مندرجہ بالا آرا خود اُن کے قابل قدر ساتھیوں کی ہیں اور یقیناً یہ نظریات ان کے خلاف فتووں کی بنیاد بنے۔ اس ضمن میں سرسید ایک بزرگ معتقد کو طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں :

«میری نسبت تو بہ سبب میری تصنیفات کے فتوی ہائے کُفر ہو چکے ہیں ۔ آپ میری تحریرات کو پسند فرماتے ہیں ، آپ پر بھی فتوی ہائے کفر ہو جائیں گے» (۱۵) ۔

اور یہی بنیاد علی گڑھ کالج کی مخالفت کا باعث ہوئی ۔ سرسید نے خود ایک تقریر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور کہا :

«جس زمانہ میں اس کالج کی تدبیریں شروع ہوئیں تو ہر جگہ کے لوگوں نے اس کو پسند کیا اور ہر حصۂ ملک سے اس کی تائید ہوئی اور ہوتی چلی جاتی ہے ، مگر بعض مذہبی مسائل جو میں نے بیان کئے اُن کے لحاظ سے البتہ لوگوں کو کچھ کچھ شبہہ ہوا اور فتور پڑا» (۱۶) ۔

شروع شروع میں جب یہ شبہات بڑھے تو بدگمانیوں نے جنم لیا جو آہستہ آہستہ صریح مخالفت میں تبدیل ہوتی گئیں ۔ مولانا حالی ان کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

«ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں ، ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لا مذہب بنانا منظور ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لئے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو ۔ اگر چہ اس خیال کا دوسرا جُز صحیح تھا مگر پہلا جُـــــز اس لئے غلط تھا کہ حالات موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو» (۱۷) ۔

غالباً پہلی ,,بدگمانی،، سرسید کے ان عزائم کے باعث پیدا ہوئی ہوگی جن کا اظہار انہوں نے کالج قائم کرنے کے اسباب اور مقاصد بیان کرتے ہوئے کیا :

,, اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلی درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یوریپن سائینسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں(۱۸)،،

دوسری ,,بدگمانی،، کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی مخالفت میں وہ علما پیش پیش ہوں گے جو انگریزی سلطنت کا استحکام ہندوستان میں نہیں چاہتے تھے شیخ محمد اکرام اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

,,جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان دقیانوسی علما نے کی جو ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے اور سرکار انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے ۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ۔ مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے اور دونوں معزّز سرکاری ملازم،، (۱۹) ۔

مولانا حالی ان کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں :

,,مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رُعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے ، ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کان پور اور دوسرے مولوی علی بخش خان سب جج گورکھ پور ۔ اگر چہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضدِ حقیقی تھے ، یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت

بدعتی ، اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا ، باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے ، یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع ان ہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں ۔ ،، (۲۰)

ان میں سے پہلے بزرگ کے متعلق ان کے خیالات سرسید کی زبانی ملاحظہ فرمائیے :

،،مولوی سید امداد العلی خان بہادر ، جو فضل الٰہی سے ہماری قوم میں ایک بہت بڑے اعلی افسر و رئیس ہیں اور ہمارے بہت بڑے شفیق دوست ہیں ، مدرسۃ العلوم میں ان کے شریک نہ ہونے سے ہم کو نہایت رنج ہے اور نیز قوم کی بھلائی میں نقصان ہے اور ہم جب ان سے ملتے ہیں ، مدرسۃ العلوم میں شریک ہونے کی التجا کرتے ہیں ۔ دربار دھلی میں بھی ہم نے اُن سے التجا کی ۔ اُنہوں نے فرمایا کہ دو شرط سے ہم شریک ہوں گے : اول یہ کہ ،،تہذیب الاخلاق ،، کا چھاپنا بند کر دو یا اُس میں کوئی مضمون متعلق بہ مذہب مت لکھو ۔ دوسرے یہ کہ اپنے عقائد و اقوال سے ، جو برخلاف علماء متقدمین ہیں ، توبہ کرو،، (۲۱) ۔

دوسرے بزرگ بھی سرسید کی ذات یا انگریزی تعلیم سے نہیں بلکہ اُن کے مذہبی خیالات سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں ۔ مولوی علی بخش خان نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

،،مجھ کو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خان صاحب ایک شخص لائق اور نامور اور معزّز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہوتا اُن کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خودرائی سے مذہبی

دست اندازی و انقلاب دین ایسا اُن کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہو گئی اور تمام قوم کو ان سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے اُن کے خیالات مذہبی سے ہے، نہ ان کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے" (٢٢)

یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آیا سرسید کے مخالف علما سرکار انگریزی نے "استحکام" کے خلاف تھے یا حامی ، کیونکہ سرکاری ملازمت میں رہ کر بھی اندرونی طور پر حکومت کا مخالف ہوا جا سکتا ہے۔ سرسید اپنے مضامین میں "قومی ہمدردی" اور "قومی عزت" کے الفاظ اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ پہلے بزرگ یعنی سید امداد العلی کو انہوں نے ان باتوں کا مخالف قرار دیا۔ اس کی تردید میں سید امداد العلی ثبوت کے طور پر اپنی "خیر خواہی سرکار" کا واقعہ یوں بیان کرتے ھیں :

"جس خیرخواہ سرکار کی نسبت یہ سی-ایس۔ آئی سید احمد خان یہ ظن رکھتا ہے کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتا ہے، اس تحریر کا محاکمہ میں حکام وقت اور جملہ مسلمانان و اہل ہنود پر چھوڑتا ہوں کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہو کر بنظر نمک حلالی اپنے آقا کے سینہ پر گولی باغیوں کی کھائے اور ہزارہا روپیہ کا مال ان سے چھڑائے ، اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر رے صاحب بہادر نکالیں کہ جس کا خون مسٹر لو صاحب ، داماد لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر ، اور جینٹ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متھرا پونچھتے جائیں اور اس گولی کا نشان تصدیق ایک تمغہ ہمدردی اور نمک حلالی ملکہ معظمہ کا، جس بہادر کے سینہ پر موجود ہو تو انصاف فرمایا جائے کہ کیا وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہو سکتا ہے ؟ " (٢٣)۔

"قومی عزت" کا یہ تمغہ حاصل کرنے والے سید امداد العلی ١٨٥٧ کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کی حمایت میں اپنے ہم وطنوں کی

گولی کھا کر زخمی ہوئے تھے ۔ جان نثاری کے اس عملی ثبوت کے بعد انہیں انگریزی حکومت کا مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ ان ہی بزرگ نے ہندوستان کے تمام مکاتیب فکر کے علماسے سرسید کے خلاف تکفیر کے فتوے حاصل کرکے رسالہ "امداد الآفاق برجم اهل النفاق ، بجواب پرچۂ تہذیب الاخلاق" کے آخر میں شائع کئے ۔ مولانا حالی ان فتووں کے مطالعہ کے بعد وضاحت کرتے ہیں :

"مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں ، کیا سنّی کیا شیعہ ، کیا مقلّد کیا غیر مقلّد ، کیا وہابی کیا بدعتی ، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سنّی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں " (٢٤)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"دلّی ، رام پور ، امروہہ ، مراد آباد ، بریلی ، لکھنؤ ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساتھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کئے تھے ، گویا ہندوستان کے تمام اہل حل وعقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا ۔ صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خان نے یہ کمی پوری کر دی ۔" (٢٥)

یعنی ان دوسرے بزرگ نے حرمین شریفین جاکر مذاهب اربعہ کے مفتیوں سے سرسید کے خلاف فتوے حاصل کئے ۔ مولانا حالی نے اپنی کتاب میں ان کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے ۔ سرسید نے ان حصول فتاوی کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے :

جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا . . . سبحان اللہ ہمارا کُفر بھی کیا کُفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے "(٢٦) ۔

مندرجہ بالا تمام حوالہ جات موضوع زیر بحث کے پس منظر پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالتے ھیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کے خلاف فتاوی کفر کی بنیاد میں انگریزی تعلیم سے مخالفت کا جو تصور ھمارے ذھنوں میں پرورش پا چکا ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں اور یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

****

حــوالــہ جــات

۱ ـ مکاتب شبلی (حصہ اول) ، مطبع شاہی لکھنؤ (۱۹۱٦) ، ص ۱۳۲
۲ ـ موج کوثر ، شیخ محمد اکرام ، فیروز سنز لاہور ، ص ٦۷
۳ ـ ایضاً ، ص ۷۷ ـ ۷۸
۴ ـ تبیین الکلام فی تفسیر التورات و الانجیل ، سرسید ، (جلد دوم) ، ذاتی پریس سرسید غازی پور علی گڑھ (۱۸٦۳ ـ ۱۸٦۵) ص ۳۳۱ ـ
۵ ـ احکام طعام اہل کتاب ، سرسید ، مطبع منشی نول کشور کان پور (۱۸٦۸) ، ص ۱۷
٦ ـ مسافران لندن ، سرسید مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹٦۱) ، ص ۴۷
۷ ـ خطوط سرسید مرتبہ سرراس مسعود ، نظامی پریس بدایوان (۱۹۲٦) ، ص ۷۱
۸ ـ موج کوثر ، ص ۷۹ ـ ۸۰
۹ ـ حیات جاوید ، الطاف حسین حالی ، انجمن ترقی اردو دھلی (۱۹۳۹) ، حصہ دوم ، ص ۲۳۵
۱۰ ـ مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک ، نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۳) ، ص ۵۰۸
۱۱ ـ ایضاً ، ص ۴۱۲
۱۲ ـ حیات جاوید (حصہ اول) ، ص ۲۰۳
۱۳ ـ بحوالہ مضحکات و مطائبات سرسید ، شیر علی خان سرخوش ، مطبوعہ لاہور (طبع اول) ، حصہ دوم ، ص ۳۳
۱۴ ـ موعظۂ حسنہ ، ڈپٹی نذیر احمد دھلوی ، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹٦۳) ، ص ۱۹۹ ـ ۲۰۰
۱۵ ـ خطوط سرسید ، ص ۳۲۹
۱٦ ـ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید ، مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰) ، ص ۱۵۳
۱۷ ـ حیات جاوید (حصہ دوم) ، ص ۲۸۲
۱۸ ـ ایڈریس اور اسپیچیس متعلق ایم اے او کالج علی گڑھ مرتبہ نواب محسن الملک ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس (۱۸۹۸) ، دیباچہ ص ۲
۱۹ ـ موج کوثر ، ص ۸۰
۲۰ ـ حیات جاوید (حصہ دوم) ، ص ۲۳۵ ـ ۲۳٦
۲۱ ـ مقالات سرسید ، مجلس ترقی ادب لاہور ، جلد دھم (۱۹٦۲) ، ص ۵٦
۲۲ ـ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، ۱۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ ھ ، ص ۲۷ ۔
۲۳ ـ مضحکات و مطائبات سرسید (حصہ اول) ، ص ۹۱
۲۴ ـ حیات جاوید (حصہ دوم) ، ص ۲۵۱
۲۵ ـ ایضاً ، ص ۲۵۳
۲٦ ـ تہذیب الاخلاق (جلد دوم) ، مطبوعہ لاہور ، ص ۵۱٦

★ ★ ★ ★ ★ ★